روشنی کا سُراغ

ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

upload by salimsalkhan@yahoo.com

روشنی کا سراغ

ایم اے راحت

چند لمحے جو احسن کے لیے بے حد نازک تھے' ایسے ہی گزرے کہ سانپ نے آگے سرکنا بالکل بند کر دیا۔ احسن نے سانس تک روک لی لیکن شکر تھا کہ یہ صورت حال چند لمحوں سے زیادہ نہ رہی' سانپ نے پھر آگے رینگنا شروع کر دیا اور جس طرح اوپر آیا تھا۔ اسی طرح آہستہ آہستہ پہلے پلنگ پر اور پھر اس کی پٹی پر چلنے لگا۔ احسن بڑی دیر سے اس کی زد میں آنے کا منتظر تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ ایک ایک انچ گھومتے ہوئے کروٹ کے بل ہو گیا تھا۔ اب سانپ اس کی داہنی جانب تھا۔ احسن نے اس طرح جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں آگے بڑھتی ہے اپنا سیدھا ہاتھ بڑھایا۔ سانپ اس وقت سرہانے کی پٹی تک پہنچ کر نصف کے قریب نیچے لٹک چکا تھا۔ بس چند انچ کی بات اور تھی۔

ایک معاشرتی کہانی' عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

لڑکیاں چاہے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل، کروڑ پتی ماں باپ کی اولاد ہوں یا بالکل غریب والدین کی، عام طور سے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں کوئی اچھا گھرانہ مل جائے اور والدین اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جائیں۔ حیدر علی صاحب کی بھی یہ ہی کیفیت تھی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا لیکن انہوں نے زارا کو ماں اور باپ بن کر پرورش کیا تھا۔ اچھی حیثیت کے مالک تھے۔ اس لیے زارا کی ہر خوشی ان کے لیے بڑی حیثیت رکھتی تھی البتہ زارا اپنے مزاج سے بالکل معتدل فطرت کی مالک تھی۔ غرور سے پاک اچھی تعلیم حاصل کرنے کی خواہشمند سلجھے ہوئے دماغ کی مالک۔

مگر حیدر علی صاحب اپنی اس اکلوتی کو بھی زندگی سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ پھر ایک دوراہا آ گیا۔ احسن زارا کا پھوپھی زاد بھائی تھا اور خود اس کے ماموں کا بیٹا احسن کے والد کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ غریب لوگ تھے اور احسن نے بڑے مشکل حالات میں اپنی تعلیم مکمل کر کے لاہور کے ایک کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی نوکری حاصل کی تھی جبکہ فواد ایک دولتمند گھرانے کا مالک تھا۔ حالانکہ زارا کے ماموں بھی مر چکے تھے لیکن کافی کاروبار اور جائیداد چھوڑ کر گئے تھے اور فواد کافی حد تک جائیداد کا انتظام خود سنبھالتا تھا۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور سارے گھر میں اسی کی چلتی تھی۔ پھر جب حیدر علی صاحب نے ایک دن زارا کو اطلاع دی کہ احسن اور فواد آئے ہوئے ہیں۔ تو وہ حیرت سے حیدر علی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔

"اچانک ہی آ گئے یہ لوگ۔"

"نہیں بیٹی اچانک ہی نہیں آئے ہیں۔ بلکہ میں نے انہیں بلایا ہے۔"

"تو پھر۔" زارا حیرانی سے بولی۔ اسے اپنے باپ کا رویہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ حیدر علی صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم جانتی ہو زارا کہ ہمارے خاندان میں لڑکیاں اپنی ذات برادری سے باہر نہیں بیاہی جاتیں اور اس وقت ہمارے خاندان میں جو لڑکے زیر غور آ سکتے ہیں۔ ان میں سے یہ دو ہی مجھے تمہارے لائق معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اسی لیے ان دونوں کو بلایا ہے کہ یہ کچھ دن ہمارے ساتھ رہیں تاکہ تم یہ فیصلہ کر لو کہ تمہاری شادی ان دونوں میں سے کس سے کی جا سکتی ہے۔"

"میں آپ کے لیے اتنی بوجھ بن گئی ابو۔" زارا نظریں جھکا کر بولی۔

"نہیں بیٹا بیٹیاں تو کبھی مرتے دم تک بھی ماں باپ پر بوجھ نہیں بنتی، لیکن ماں باپ پر بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں جنہیں وہ مجبوراً ادا کرتے ہیں۔"

"پھر ابو میری کیا ذمے داری ہے۔"

"بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرو اور سوچ سمجھ کر کرو یا پھر میں تم سے ایک بات کہوں جو ایک باپ اپنی بیٹیوں سے نہیں کہہ سکتا۔ وہ یہ کہ اگر خود کوئی تمہارے ذہن میں ہے تو مجھے اس بارے میں بتاؤ۔"

"نہیں ابو آپ یقین کریں۔ آپ میرے ابو بھی ہیں اور بہترین دوست بھی ایسی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں ہے۔"

"جاؤ بیٹا پھر ذرا ان لوگوں سے ملو۔ اس وقت ذرا دوسرے انداز میں اپنی نگاہ استعمال کرو۔" زارا عجیب کشمکش کا شکار ہو گئی تھی۔ یہ پہلی انوکھی ڈیوٹی تھی جو حیدر علی نے اس کے سپرد کی تھی۔ بہرحال وہ ڈرائینگ روم میں پہنچ گئی۔ ظاہر ہے، عزیز تھے، کزن تھے، ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن آج زارہ کی نگاہوں کا انداز بہت عجیب تھا۔ ویسے احسن اور فواد دونوں ہی اپنے اپنے انداز میں اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ لمبا قد و قامت، بہترین جسامت البتہ فواد کا جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا اور اس کی نگاہوں میں شوخی۔ بلکہ بے باکی سی تھی زارہ نے محسوس کیا کہ وہ باتیں کرتے ہوئے اسے ہر زاویے سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ احسن کی نظروں میں پاکیزگی تھی۔

تھوڑی دیر تک مختلف باتیں ہوتی رہیں اور زارا دونوں کا تجزیہ کرتی رہی پھر حیدر علی صاحب بھی ان کے درمیان پہنچ گئے۔ تو زارا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے اجازت دیجیے آپ کا حکم تھا ابو ورنہ میں نادیہ کو ملاقات کا وقت دے چکی تھی۔"

نادیہ زارا کی واحد دوست تھی اور دونوں عام طور سے ساتھ ہی دیکھی جاتی تھیں۔ بہرحال لڑکیوں کے مسائل بھی تقریباً یکساں ہی ہوتے ہیں۔ زارا پر اچانک ہی یہ افتاد پڑی تھی کہ اسے ایک طرح سے سوئمبر رچانا تھا۔ تو نادیہ بھی اس مشکل کا شکار تھی اس سے بھی شادی کے بارے میں کوئی فیصلہ مانگا گیا تھا۔ زارا نے جب اسے اپنی کہانی سنائی تو نادیہ بے اختیار ہنس پڑی وہ بولی۔

"یہ تو مزے کی بات ہے۔ ویسے سیدھی سی بات ہے۔ جو اچھا لگے اس کے گلے میں ہار ڈال دو۔"

"نہیں نادیہ یہ انتخاب دل سے نہیں دماغ سے کرنا ہے مجھے۔"

"دیکھنے میں دونوں کیسے ہیں۔" نادیہ نے سوال کیا۔

"ٹھیک ہیں اپنے اپنے انداز میں دونوں ہی اچھے ہیں۔"

"اور معاشی اعتبار سے کس کا پلڑا بھاری ہے۔"

"فواد کا وہ ایک دولت مند باپ کا بیٹا ہے اور اچھے کاروبار کے مالک ہیں یہ لوگ۔"

"اور احسن صاحب۔"

"احسن ڈاکٹر ہیں۔ مگر میڈیسن کے نہیں۔ معاشیات میں پی ایچ ڈی کیا ہے اور سردست ایک کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔"

"باپ رے باپ۔ معاشیات کے پروفیسر۔ ایک ایک پائی کا حساب کریں گے تم سے۔ میرا مشورہ مانو تو فواد کی کار میں بیٹھ جاؤ۔"

"میں آنکھیں بند کر کے کوئی کام کرنے کی قائل نہیں ہوں۔"

"تو پھر ٹاس کر لو۔"

"نادیہ! میں تم سے کسی سنجیدہ مشورے کی امید رکھتی تھی۔ مگر تم تو بالکل فضول باتیں کرنے لگیں۔"

"جی جناب! یہ بات ہے تو ذرا سکون سے دونوں کو پرکھو اور پھر کوئی رائے قائم کرو۔" نادیہ نے جواب دیا۔

"میرا بھی یہ ہی خیال ہے۔" زارا نے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

اس کے بعد کچھ دیر تک کالج کی باتیں ہوتی رہیں کئی مشترکہ سہیلیاں یاد آئیں جواب تقریباً بچھڑنے والی تھیں اسی گفتگو میں شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ زارا نے رخصت کی اجازت چاہی۔ نادیہ کچھ پھیلی ہوئی چیزوں خاص کر تصویروں کو جو دوران گفتگو الماری سے نکل آئی تھیں۔ سمیٹنے میں ذرا پیچھے رہ گئی۔ زارا کمرے سے نکل کر راہداری میں آئی تو شارق نے اس کا راستہ روک لیا۔ شارق نادیہ کا چھوٹا بھائی تھا اور زارا اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتی تھی۔

"بڑی دیر سے آپ کے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔" شارق نے کہا۔ "چند باتیں ہم غریبوں سے بھی کر لیا کریں۔"

"کیا بات ہے۔" زارا نے یونہی پوچھ لیا۔

"میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جب انتخاب کا حق آپ کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے تو ایک تیسرا نام بھی شامل کر لیں۔"

"تو تم ہماری باتیں سن رہے تھے۔" زارا نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"جی ہاں۔ بڑی اچھی عادت ہے۔ کبھی کبھی بہت مفید باتیں کانوں میں پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً ابھی بات کریں۔ اگر میں یہ نیک کام نہ کرتا تو مفت میں مارا جاتا۔"

"کیا مطلب۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مطلب تو واضح ہے اور اب سے نہیں' بہت دنوں سے آپ دانستہ انجان بنیں تو دوسری بات ہے۔"

"میں بکواس سننے کی عادی نہیں ہوں۔" زارا کو غصہ آنے لگا۔

"یہ بکواس نہیں انتہائی سنجیدگی سے غرض ہے کہ اس خادم کے علاوہ کسی اور کے نام کی پرچی کھلی تو قیامت آجائے گی۔"

"اور اس قیامت کا ایک نمونہ میں پیش کرتی ہوں۔" زارا نے الٹے ہاتھ سے ایک زبردست تھپڑ رسید کردیا۔

شارق نے زارا کی کلائی پکڑلی۔ وہ ایک طویل قامت اور صحت مند نوجوان تھا۔ تھوڑی ہی قوت صرف کی تھی کہ زارا کو تکلیف ضبط کرنے کے لیے اپنے جبڑے بھینچنا پڑے' ٹھیک اسی وقت پیچھے سے نادیہ کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ شارق! اپنے ہوش میں ہو یا نہیں ہاتھ چھوڑ دو۔" شارق نادیہ سے کافی ڈرتا تھا۔ اس نے گھبرا کر زارا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اسے گھورتے ہوئے آگے چل دیا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا۔ یہ بے ادب تمہارا بھی لحاظ نہیں کرے گا۔" نادیہ کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ میں بڑی ندامت کے ساتھ تم سے معافی چاہتی ہوں۔"

"میں بہت دن سے اس کی بدتمیزی برداشت کررہی ہوں۔" زارا کی آواز کانپ رہی تھی۔

"تمہارا بھائی ہے۔ صرف اس خیال سے خاموش ہو جاتی تھی لیکن آج اس نے حد کردی اسے خبردار کردینا کہ وہ اس زعم میں نہ رہے کہ اس کے والد محکمہ پولیس میں ایس پی ہیں۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو اس کے رعب میں آجاتی ہیں آئندہ اس نے ایسی کوئی حرکت کی تو سب کے سامنے ایسی ناچوشی کر دوں گی کہ ساری اکڑ بھول جائے گا۔"

"میں ایک بار پھر معافی مانگتی ہوں۔" نادیہ کو واقعی اپنے بھائی کی اس حرکت پر افسوس تھا۔ "اور تم ابو کا حوالہ مت دو ان کے نام سے تو اس کا دم نکلتا ہے۔ انہوں نے کبھی اس کی غلط حرکتوں کو حوصلہ افزائی نہیں کی' ویسے میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ آئندہ تمہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ شارق کی کچھ دکھتی رگیں میرے ہاتھوں میں ہیں۔ جن کے وہ ابو کے کانوں میں پہنچنے کے خیال سے ہی ڈر جاتا ہے۔ میں اسے الجھا دوں گی۔ وہ نہ صرف تم سے معافی مانگے گا بلکہ کبھی کسی گستاخی کی ہمت نہیں کرسکے گا۔"

زارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ نادیہ کی تمام تسلیوں اور اپنے تمام تر غصے کے باوجود اسے یقین نہیں آیا تھا کہ شارق آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔

دوسرے دن سے تفریحی پروگرام بننے لگے۔ حیدرعلی صاحب نے اپنی بے پناہ مصروفیت کا ذکر کر کے اپنے آپ کو دانستہ پیچھے رکھا۔ ان کے پاس دو کاریں تھیں۔ زارا کی اپنی اسپورٹ کار کے علاوہ جسے وہ خود ڈرائیو کرتی تھی' ایک ان کے استعمال میں رہتی تھی اور دوسری بالکل ورکنگ کنڈیشن میں گیرج میں موجود رہا کرتی تھی۔ صرف اس لیے کہ حیدرعلی صاحب کچھ فطرتاً بہ یک وقت متبادل ذرائع اپنے ہاتھ میں رکھنے کے قائل تھے۔ اپنی کار کے لیے انہوں نے ایک ڈرائیور بھی رکھا ہوا تھا۔ جو کم وبیش ان کے پاس پچیس سال سے کام کررہا تھا۔ وہ اس پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ یہ ڈرائیور اپنی دوسری کار کے ساتھ انہوں نے زارا احسن اور فواد کے حوالے کردیا کہ وہ جب چاہیں کہیں بھی جاسکیں۔ البتہ ڈرائیور کو انہوں نے مناسب الفاظ میں تاکید کردی تھی کہ وہ ان لوگوں اور خاص طور سے زارا کا خیال رکھے۔ اس سے ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ انہیں تمام حالات کی پر اعتماد رپورٹ ملتی رہے۔

ڈرائیور کے علاوہ بنگلے میں دو بیرونی ملازم اور تھے۔ ایک چوکیدار اور ایک مالی اور یہ سب بنگلے کے

عقب میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹرز میں رہا کرتے تھے۔ ڈرائیور اور مالی اپنے اہل وعیال کے ساتھ اور چوکیدار تن تنہا جیسا کہ بڑے لوگوں میں رواج ہے وہ پٹھان تھا اور علاقہ غیر کا رہنے والا تھا اور اس کے بال بچے بھی وہیں تھے اور وہ ہر سال اپنی جگہ اپنے کسی بھائی بند کو اپنی ڈیوٹی سپرد کر کے دو تین ماہ کے لیے اپنے ملک جایا کرتا تھا۔ مالی کو حیدرعلی صاحب نے خاص طور سے مزارعین میں سے منتخب کیا تھا اور وہ باغبانی میں کافی ماہر تھا۔ اس کا نام فیروز دین تھا۔ اور پچھلے برس ہی اپنی بیوی کو گاؤں سے لایا تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا تقریباً چھ سات برس کا اور دوسری لڑکی' دو ڈھائی سال کی ڈرائیور دین محمد چار بچوں کا باپ تھا اور اس نے ان سب کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ دو بیٹیوں کی شادی کر کے اور دو بیٹوں کو موٹر میکینک کا کام سکھا کر ایک ورکشاپ کھلوا کردی۔ چنانچہ منطقی بات تھی کہ چونکہ دونوں مہمان راولپنڈی اور لاہور سے آئے تھے۔ اس لیے پہلے انہیں شہر کے معروف اور قابل دید مقامات دکھائے جائیں۔ چنانچہ ابتدائی پروگرام کچھ اسی نوعیت کے تھے لیکن یہ بات دو تین دن کے اندر کافی واضح ہوکر سامنے آگئی کہ فواد کسی فیصلے کے اعلان سے قبل ہی خود کو کامیاب تصور کرتا ہے اور محض خیال کرنا کیا معنی اپنے حق میں افضل جانتا ہے۔ پھر اسے غالباً احسن کے مقابلے میں اپنی دولت مندی کا غرور بھی تھا اور وہ بھی کافی اچھے انداز میں جس کا اظہار وہ موقع ومحل کا احساس کیے بغیر کرتا رہتا تھا لیکن اگر اس کا یہ اندازہ تھا کہ اس قسم کی باتیں زارا کو متاثر کرسکتی ہیں تو وہ اس میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ بلکہ زارا اس کے کردار کا تصنع اور سطحی پن دیکھ کر نمایاں طور پر اس سے کترانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

فواد کے برعکس احسن کا طرزعمل ابتداء سے ہی ایک رکھ رکھاؤ لیے ہوئے تھا۔ وہ ہر پروگرام میں شامل ضرور رہتا تھا لیکن اس نے کبھی خود کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فواد کا طریقہ یہ تھا کہ وہ احسن کو اس طرح نظرانداز کرے۔ جیسے وہ ان کے ساتھ آیا ہی نہ ہو۔ زارا کو اپنے ساتھ لگائے رکھنا چاہتا تھا۔ احسن دانستہ اپنے آپ کو پس منظر میں لے جاتا اور کبھی بلاوجہ ان کے درمیان آنے کی کوشش نہ کرتا جب کہ فواد کا حال یہ تھا کہ اگر کبھی زارا خود اس کی باتوں سے بور ہو کر احسن کی طرف متوجہ ہوجاتی تو وہ انہیں تنہائی کے چند لمحے بھی دیے بغیر ان کے درمیان میں کود پڑتا اور وہ بھی اس بے ڈھنگے پن سے کہ اکثر زارا کو اس کی یہ مداخلت ناگوار گزرتی۔ شروع میں تو اس نے یہ لحاظ رکھا کہ اس نے اپنی ناگواری الفاظ کے بجائے انداز کی حد تک رکھی لیکن جب فواد نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا تو زارا نے ایک دو مرتبہ اسے صاف گوئی سے ٹوک دیا کہ یہ دخل درمعقولات مہذب سوسائٹی میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

اسی طرح کی کچھ اور باتوں نے فواد کی خوش فہمیوں کا تانا بانا بکھیرنا شروع کردیا۔ اسے یہ اندازہ ہونے لگا کہ ہوا کا رخ کسی اور طرف ہی جارہا ہے۔ اس نے حیدرعلی صاحب کو اپنی طرف ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا کہ برخوردار اگر یہ خوشامد اس لیے کررہے ہو کہ میں زارا سے تمہاری سفارش کرسکوں تو بے کار وقت ضائع کررہے ہو۔ میں نے اسے فیصلہ کرنے کی پوری آزادی دے دی ہے۔

"اور بہرطور اسی کے انتخاب سے یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ اس لیے میرے بجائے اسے اپنے طرز عمل سے متاثر کردو۔"

ان ہی دنوں ایک شام پکچر دیکھنے کا پروگرام بنا۔ تقریباً زبردستی فواد نے کسی سے مشورہ کیے بغیر پنجابی فلم کی تین سیٹیں بک کرالیں۔ زارا کو نہ صرف یہ بات اس لیے بری لگی کہ فواد نے کسی سے پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ پنجابی فلموں کے بارے میں اس کی رائے بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ جانے سے انکار کرنا چاہتی تھی لیکن احسن نے سفارش کی کہ فواد صاحب بڑے ذوق وشوق سے اپنی پسندیدہ فلم

WWW.PAKSOCIETY.COM

دکھانا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگانا چاہیے۔

بہر حال وہ فلم دیکھنے پہنچے' کار فواد چلا رہا تھا۔ کیونکہ اتفاق سے اس رات حیدر علی صاحب کو کسی دوست سے ملنے جانا تھا اور وہ رات کو کار ڈرائیو کرنے سے بچتے تھے۔ اس لیے دین محمد کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ فواد نے سینما کے مقرر کردہ پارکنگ پلاٹ پر گاڑی کھڑی کی' احسن اور زارا پہلے اتر گئے۔ فواد نے جلدی سے ریزرویشن سلپ نکال کر احسن کو دی کہ وہ جا کر سیٹیں دیکھے۔ زارا اور وہ خود پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ احسن خاموشی سے چلا بھی جاتا لیکن زارا نے کہا کہ فواد خود کار پارک کر کے آجائے۔ وہ احسن کے ساتھ جا رہی ہے۔

ابھی دونوں فٹ پاتھ پر آئے ہی تھے کہ سینما کے سامنے ہجوم کے باعث انہیں سڑک پر اترنا پڑا ادھر احسن نے سڑک پر قدم رکھا اور ادھر مخالف سمت سے ایک کالے رنگ کی بڑی کار تیزی سے آگے بڑھی' احسن اس طرح اس کی زد میں تھا کہ زارا کی چیخ نکل گئی لیکن احسن نے اپنے اوسان بحال رکھے بغیر کسی بوکھلاہٹ یا گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر وہ کار کے قریب آتے ہی ایک جست مار کر اس کی زد سے نکل گیا۔ کار کے پہیے چیخے مگر وہ رکی نہیں اور اسی تیز رفتاری سے قریبی گلی میں گھوم کر نظروں سے غائب ہوگئی۔ زارا کی نظر صرف ایک لمحے کے لیے اس کے ڈرائیور پر پڑی تھی۔ اس نے ڈرائیوروں جیسی کیپ سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا لیکن نجانے کیوں زارا کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ کار شارق چلا رہا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی متوجہ ہو چکے تھے لیکن احسن اس حادثے سے بظاہر قطعی غیر متاثر سا مسکراتے ہوئے واپس فٹ پاتھ کی طرف آیا۔

''آپ کے شہر کی ایک یہ بھی خرابی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کہ یہاں کے لوگ بڑی ریش ڈرائیونگ کرتے ہیں۔''

''یہ ان کی نادانستہ غلطی نہیں تھی۔'' زارا نے جوش سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بلکہ اس نے آپ کو جان بوجھ کر مارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ آپ حاضر دماغی سے کام لے کر بچ گئے۔ ورنہ......''

''مگر کوئی مجھے جان بوجھ کر مارنے کی کوشش کیوں کرے گا۔'' احسن نے حیرت سے پوچھا۔ زارا اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ مگر وہ احسن کو کیا جواب دیتی۔ اسی وقت فواد بھی آگیا۔

''آپ لوگ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں۔'' اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''ابھی کسی کار نے احسن صاحب کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔'' زارا نے جلدی سے کہا اور مختصر الفاظ میں تفصیل بیان کی۔

''کوئی اناڑی ڈرائیور ہوگا۔'' فواد نے بے پروائی سے کہا اور آگے قدم بڑھا دیے۔ ''ورنہ کسی کو احسن سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔''

''میرا بھی یہ ہی خیال ہے۔'' احسن بولا۔ ''زارا تو ذرا سی بات پر بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں۔''

وہ سب سینما ہال میں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مقررہ وقت سے دس منٹ بعد فلم شروع ہوئی اور جلد ہی معلوم ہو گیا کہ انتہائی غیر دلچسپ اور بور فلم ہے۔ زارا تو ہاف ٹائم کے بعد گھر واپس جانا چاہتی تھی لیکن احسن کے سمجھانے سے زیادہ فواد کی ناراضگی کے خیال سے رک گئی۔ اس نے اشارتاً دھمکی دی تھی کہ اگر زارا آدھی فلم چھوڑ کر گئی تو وہ کل ہی پہلی فلائیٹ سے اپنے گھر واپس چلا جائے گا۔ پھر بھی اپنی بوریت دور کرنے کے لیے وہ باقی تمام وقت احسن سے مختلف باتیں کرتی رہی۔ جو فواد کے نزدیک اس کے واپس جانے سے بھی زیادہ قابل اعتراض بات تھی۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے خود ہی زارا کو روک کر یہ موقع فراہم کیا تھا۔

پکچر ختم ہوئی تو زارا اس طرح اطمینان کی گہری سانس لے کر سینما ہال سے نکلی جیسے کوئی کسی لمبی قید سے رہائی پاتا ہے۔ ہجوم کے گزر جانے کے خیال سے وہ وہیں ایک طرف رک گئے تھے۔ تقریباً تمام لوگ نکل گئے۔ تب وہ بھی آگے بڑھے فواد نے حسب عادت حکم چلانے کے سے انداز میں جیب سے چابی نکال کر احسن کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''تم کار لے کر آؤ۔'' وہ بولا۔ ''میں اور زارا فٹ پاتھ پر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔''

وہ دل ہی دل میں یہ اسکیم بنا رہا تھا کہ ڈرائیونگ احسن کے سپرد کر کے وہ زارا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائے گا اور یوں اس تکلیف کا کچھ مداوا کر سکے گا۔ جو وہ سینما ہال میں برداشت کر چکا ہے۔ احسن چابی لے کر اس کے رنگ کو ایک انگلی میں گھماتے ہوئے فٹ پاتھ سے سڑک پر آنا چاہتا تھا کہ رنگ اس کی انگلی سے نکل کر فٹ پاتھ پر گر گیا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے ایک قدم رکھا ہی تھا کہ ایک کار زناٹے سے اس کے قریب سے گزر گئی۔ اس مرتبہ وہ پشت کی جانب سے آئی تھی اور اگر احسن سڑک پر اتر گیا ہوتا تو اس کے کار کے نیچے آنے سے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن چابی اٹھانے کے لیے رکنے کی وجہ سے وہ بال بال بچ گیا۔

زارا چیخ پڑی۔ ''دیکھا آپ نے۔'' وہ فواد کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

''یہ وہی پہلے والی کار تھی اور اس نے یہ دوسری مرتبہ احسن صاحب کو مارنے کی کوشش کی ہے۔'' وہ جلدی سے قدم بڑھا کر احسن کے پاس آگئی۔

''آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی۔'' اس نے تیزی سے پوچھا۔ ''میں نے آپ کو جھکتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''وہ تو میں چابی اٹھانے کے لیے جھکا تھا۔'' احسن کا لہجہ قدرے فکر مند تھا۔ ''مگر خدا کا شکر ہے کہ اسی حرکت نے جان بچا دی۔ مگر یہ تو ایسا لگا ہے جیسے کوئی سچ مچ مجھے مرحوم بنانے پر تلا ہوا ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو اس جان ناتواں کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔''

''بے کار باتیں مت کرو۔'' فواد نے کہا۔ ''یہ محض ایک اتفاق تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کار ڈرائیور نے سینما سے نکلنے والے کی تلاش میں کچھ چلانے کے لیے اس طرف اسٹیرنگ گھما دیا ہوگا۔''

''ممکن ہے۔ تمہارا ہی خیال درست ہو۔'' احسن نے جواب دیا اور پارکنگ کے احاطے کی جانب بڑھ گیا۔

[illegible] فواد کی اسکیم بھی فیل کر دی۔ زارا نے اسے کار چلانے کی تاکید کی اور خود احسن کے ساتھ بیٹھ گئی۔

وہ تین دن اور گزر گئے۔ زارا [illegible] سینما والے حادثے کی وجہ سے ڈری ہوئی اور سب سے اس دوران گھر سے نکلنے کے لیے کسی طرح رضامند نہیں ہوئی نتیجے میں کوئی پروگرام نہیں بن سکا۔ فواد نے بڑی کوشش کی اس نے ابتدائی دنوں میں زارا کو تحائف سے بھی پرچانا چاہا تھا لیکن زارا نے اسی سے منع کر دیا تھا کہ ابھی کسی اعتبار سے ان تحائف کو قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ بعد میں بھی کہ اس طرح کی کوئی کوشش [illegible] اور [illegible] کی تعریف میں آ سکتی ہے۔ جس سے نہ صرف [illegible] ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اس کا الٹا ری ایکشن کا بھی امکان بڑھ جاتا ہے۔ فواد نے گھبرا کر فوراً توبہ کر لی اور اس کے بعد اس نوعیت کی کوئی کوشش نہیں کی۔

☆☆

مالی فیروز دین نے بنگلے کو خوب صورت اور سرسبز بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ طرح طرح کے پھولوں کی کیاریوں کے علاوہ مختلف اقسام کی بیلیں لگے ہوئے گملے۔ مزید سجاوٹ کے لیے اس نے بنگلے کے پچھلے حصے میں بھی جہاں جہاں گملوں کو خوب صورتی سے رکھا جا سکتا تھا ترتیب سے سجا دیا تھا۔ اس وقت جبکہ چائے پیتے ہوئے فواد زارا کو اس بات کے لیے آمادہ کر رہا تھا کہ شہر کی سیر تو کافی کر لی اب کیوں نہ شہر سے دور اپنی زمینوں پر آؤٹنگ اور شکار کے لیے چلا جائے۔ فیروز دین کا سات سالہ بیٹا جس کا جسم کچھ گرا پڑا سا تھا۔ ایک ہاتھ کی لکڑی ہاتھ میں لیے

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
upload by salimsalkhan

ربڑ کی گیند سے کھیلتا ہوا لان پر آ گیا تھا۔ وہ ایک خوب صورت صحت مند بچہ تھا' اس لیے ملازمین میں ہی نہیں بنگلے والوں میں بھی پسند کیا جاتا تھا۔ حیدر علی صاحب اور زارا دونوں ہی اسے پیار کرتے تھے اور اس پیار ہی کی وجہ سے اسے یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ بنگلے کے جس حصے میں بھی چاہتا' بھاگتا دوڑتا اور کھیلتا رہتا تھا۔

"تو پھر شکار کے پروگرام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔" فواد نے پوچھا۔

"آپ کہہ تو اس طرح رہے ہیں جیسے بڑی ماہر اور تجربہ کار شکاری ہوں۔" زارا نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" فواد نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ "بے شمار مرغابیاں مارنے کے علاوہ میں اب تک چار ہرن' دو نیل گائے اور ایک چیتے کا شکار کر چکا ہوں اور یہ صرف دو سال کا اسکور ہے۔ اگر کہیں کچھ پہلے سے کھیل رہا ہوتا۔"

"تو اب تم ہمارے ملک کے تمام جنگل جانوروں سے خالی ہو گئے ہوتے۔" زارا نے کچھ شوخی سے بات مکمل کی۔

"تم مذاق سمجھ رہی ہو ناں۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ ایک بار چل کر دیکھو تو سہی کہ تمہارے اس خادم کا نشانہ کیسا ہے۔"

"مجھے ذاتی طور پر شکار سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر یہ پروگرام بنا بھی تو صرف آپ کی تعمیل ارشاد کے لیے بنے گا۔" زارا نے احسن کی طرف دیکھا۔ "کیوں احسن صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔"

"ان سے کیا پوچھ رہی ہو۔" فواد نے طنز کیا۔ "میرا دعویٰ ہے کہ ان حضرت نے آج تک کوئی بندوق یا رائفل ہاتھ میں چھو کر بھی نہیں دیکھی ہو گی۔ اسے چلانا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"آپ کا دعویٰ تقریباً صحیح ہے۔" احسن نے متانت سے جواب دیا۔ "میں نے واقعی کبھی کوئی شکار نہیں کھیلا۔"

"آپ کی کسر نفسی کا بھی جواب نہیں۔" زارا بولی۔ "اس طرح بات کرتے ہیں کہ سننے والے کو خوانخواہ یقین آ جائے۔ شکار کے بارے میں تو خیر میں نہیں جانتی لیکن پچھلے سال پھوپھی جان کے ایک خط سے پتا چلا تھا کہ آپ نے رائفل کلب کے سالانہ مقابلوں میں بہترین نشانہ بازی کا مقابلہ جیتا تھا۔"

"کیا واقعی!" فواد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ارے نہیں فواد صاحب!" احسن نے سادگی سے جواب دیا۔ "زارا کو تو چھوٹی چھوٹی باتیں اچھالنے میں کمال حاصل ہے۔ وہ بھی کوئی مقابلے تھے۔ جن میں بچوں کی ایئر گن سے نشانہ بازی کا مقابلہ کرایا جائے۔"

"بچوں کی ایئر گن۔" فواد نے مزید حیرت سے پوچھا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے وہ کوئی آٹھ ایم ایم کی رائفل ہو۔ مگر مجھے تو ایئر گن ہی معلوم ہو رہی تھی۔"

زارا نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "آپ ایسی باتیں کتنی سنجیدگی سے کر لیتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "مجھے تو......!"

پتا نہیں وہ کیا کہنے والی تھی کہ احسن کے ایکدم کھڑے ہونے کے باعث اسے رکنا پڑا۔ احسن سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زارا نے بھی اس جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ رحیم بھاگتے بھاگتے ٹھوکر لگ جانے سے گر پڑا ہے۔ احسن جلدی سے اسے اٹھانے آگے بڑھا۔ ادھر اس نے قدم بڑھایا اور ادھر ٹھیک اس کے سر کے اوپر دیوار پر رکھا ہوا بھاری گملا ایکدم دیوار کے اوپر سے ٹھیک اس مقام پر گرا جہاں احسن بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی مٹی اور ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔

زارا نے چونک کر نگاہ اٹھائی تو خدا جانے یہ اس کی نظروں کا دھوکہ تھا یا اوپر واقعی کوئی تھا۔ اسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ گملا گرنے کے بعد کوئی اوپر سے جھانک رہا تھا غالباً یہ یقین کرنے کے لیے کہ اس کی

کوشش کامیاب ہوئی یا نہیں' دیکھنے والا فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا لیکن زارا کو ایک بار پھر یہ گمان گزرا کہ وہ شارق ہے۔ احسن تو رحیم کو اٹھا کر حیرت سے گرے ہوئے گملے کو دیکھ رہا تھا۔ مگر زارا اپنی کرسی سے اٹھ کر تیزی سے بنگلے کے عقبی حصے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ جس طرف بنگلے کی چھت پر جانے کے لیے چکردار لوہے کا زینہ بنا ہوا تھا لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اگر کوئی تھا بھی تو اتنی دیر میں اس کے پاس کافی وقت تھا کہ وہ زینے سے اتر کر بنگلے کی چار دیواری پھلانگ جائے۔ جو کچھ ایسی زیادہ اونچی بھی نہیں تھی۔ زارا نے چوکیدار کو اوپر بھیجا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

زارا واپس آئی تو احسن دوسری کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"تم بلاوجہ اتنی پریشان ہو رہی ہو۔" فواد نے کہا۔ "گملا اتفاقاً بھی گر سکتا ہے۔"

"مگر میں نے کسی کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔" زارا نے اصرار کیا۔

"جو تمہارا وہم بھی ہو سکتا ہے۔"

"آپ تو کہیں گے۔" زارا کے لہجے میں ترشی آ گئی۔ "کیونکہ آپ اس کی زد میں نہ تھے۔"

"اگر میں ہوتا تو شاید تم اتنی پریشان بھی نہ ہوتیں۔"

گفتگو نازک صورت حال اختیار کرنے لگی تھی۔ احسن نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے اس پروگرام کی بات چھیڑ دی جو اس سے قبل زیر بحث تھا لیکن زارا یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی کہ سردست وہ کہیں جانا نہیں چاہتی۔ اگر فواد صاحب شکار کا ایسا ہی شوق رکھتے ہیں تو خود چلے جائیں ان کے لیے انتظام کر دیا جائے گا۔

اور یہ اس سے دوسری رات کی بات ہے کہ سوتے سوتے اچانک احسن کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بہت چوکنا سونے کا عادی تھا۔ اگر ایسا ہی غیر معمولی طور پر تھکا ہوا نہ ہو تو ذرا سی آہٹ سے اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اس وقت بھی کوئی ایسی ہی بات تھی لیکن پہلے احسن کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ کچھ دیر تک یونہی سوچتا رہا کہ اسے جگانے والی کیا بات ہو سکتی ہے۔ موسم اتنا گرم نہیں تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ ایک کھڑکی کا رخ باہر لان کی جانب تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں سانپ کے پھنکارنے جیسی آوازیں آئیں۔

اس نے چونکتے ہوئے آواز کی طرف دیکھا ایک کالے رنگ کا لمبا سا سانپ پٹی کی جانب سے پلنگ پر چڑھ رہا تھا۔ احسن گھبرا گیا۔ سانپ اس کے پیروں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت ذرا سی حرکت اسے حملہ کرنے پر آمادہ کر سکتی تھی۔ احسن نے دم سادھ لیا اور بالکل بے حس و حرکت ہو کر لیٹ گیا۔

سانپ رینگتا بل کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ قدرے ترچھے زاویے سے احسن کی ٹانگوں پر چڑھ گیا۔ اس وقت وہ آدھا بستر پر اور آدھا احسن کے جسم پر تھا۔ اس صورت حال کو تحمل جیسی خاموشی سے برداشت کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی لیکن احسن اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت اس کی زندگی کا دارومدار ہی اس بات پر ہے کہ وہ اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھے اور ذرا سی حرکت نہ کرنے میں کتنا کامیاب رہتا ہے۔ وہ سانس بھی آہستگی سے لے رہا تھا کہ دل تو درکنار پھیپھڑوں کی حرکت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

سانپ آہستہ آہستہ پورا کا پورا احسن کے اوپر آ گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ بھی کچھ سننے اور محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

چند لمحے جو احسن کے لیے بے حد نازک تھے ایسے بھی گزرے کہ سانپ نے آگے سرکنا بالکل بند کر دیا۔ احسن نے سانس تک روک لی لیکن شکر تھا کہ یہ صورت حال چند لمحوں سے زیادہ نہ رہی' سانپ نے پھر آگے رینگنا شروع کر دیا اور جس طرح اوپر آیا

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ اسی طرح آہستہ آہستہ پہلے پلنگ پر اور پھر اس کی پٹی پر چلنے لگا۔ احسن بڑی دیر سے اس کے زد میں آنے کا منتظر تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ ایک ایک انچ کھسکتے ہوئے کروٹ کے بل ہو گیا تھا۔ اب سانپ اس کے داہنی جانب تھا۔ احسن نے اس طرح جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں آگے بڑھتی ہے اپنا سیدھا ہاتھ بڑھایا۔ سانپ اس وقت سرہانے کی پٹی تک پہنچ کر نصف کے قریب نیچے لٹک چکا تھا۔ بس چند انچ کی بات اور تھی۔

جیسے ہی سانپ کچھ اور آگے سرکا' اس کی دم ہاتھ کی زد میں آ گئی' احسن کا ہاتھ بجلی کی طرح چمک کر لپکا دوسرے ثانیہ میں وہ دم کو انتہائی قوت سے پکڑ کر ایک جست مارتے ہوئے پلنگ سے کود چکا تھا اور پھر اس نے کسی کوڑے کی طرح سانپ کو پوری قوت سے لگاتار فرش پر مارنا شروع کر دیا۔ تین چار ضربوں میں ہی سانپ بے دم ہو گیا۔

مزید چند ضربات نے اس کا کچومر نکال دیا۔ احسن نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس کا جائزہ لیا اور پھر جوتے کی ایڑی سے اس کا پھن مزید کچل ڈالا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو فیصدی مر چکا ہے تو اس نے مردہ سانپ کو جوتے کے ڈبے میں (یہ جوتے اس نے کچھ دن پہلے ہی خریدے تھے) ڈال کر ڈبے کو ستلی سے باندھ دیا۔ اٹیچڈ روم میں جا کر ہاتھ دھوئے۔ واٹر کولر سے پانی پیا۔ گہری نظروں سے کمرے کا گوشہ گوشہ دیکھا اور پھر اطمینان سے لیٹ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کافی باہمت اور حوصلہ مند ہونے کے باوجود اسے دوبارہ نیند آنے میں دیر لگی۔

☆☆

اگلی صبح وہ تینوں ناشتے کی میز پر جمع ہوئے تو احسن کے ہاتھ میں جوتے کا ڈبہ تھا۔ جسے اس نے بڑی احتیاط سے میز کے ایک کنارے پر رکھ دیا۔

''اس میں کیا ہے۔'' زارا نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

''جوتے کے ڈبے میں جوتوں کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔'' فواد بولا۔

''کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔'' احسن نے سرسری انداز میں کہا۔

''مثلاً کیا۔'' فواد نے پوچھا۔

''خود کھول کر دیکھ لیں۔''

''میں دیکھتی ہوں۔'' زارا کھڑی ہو گئی۔

''میرا خیال ہے۔ فواد صاحب ہی کو دیکھنے دیں۔'' احسن نے کہا۔

''اور آخر کو وہ شکاری ہیں۔''

''اب تو ضرور میں ہی دیکھوں گی۔'' زارا نے ڈبے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس وقت ڈبہ ستلی سے بندھا ہوا نہیں تھا۔ زارا نے جیسے ہی اس کا ڈھکنا اٹھایا' اس کی نظر مردہ سانپ پر پڑی جو کم سے کم ایک گز لمبا تھا اور ایک ڈھیر کی شکل میں ڈبے میں پڑا تھا۔ اس کے منہ سے ایک دبی دبی سی چیخ نکلی اور وہ جلدی سے گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

''سانپ۔'' اس نے بے اختیار احسن کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا مذاق ہے۔ احسن صاحب۔''

''یہ مذاق کسی نے رات میرے ساتھ کیا تھا۔'' احسن نے اس طرح کہا جیسے وہ کوئی پرلطف کہانی بیان کر رہا ہو۔ ''آج کل لوگ مذاق ہی مذاق میں کسی کی جان بھی لے لیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ کوشش جس نے بھی کی تھی' اسے خاصی مایوسی ہوگی کہ سانپ کے ذریعے میرے مرنے کے بجائے سانپ میرے ہاتھوں مر گیا۔''

اس کے بعد اس نے زارا کے مسلسل سوالات کے جواب میں رات کا گزرا ہوا واقعہ سنا دیا۔ زارا کے چہرے کا رنگ جو پہلے قدر سفید پڑ گیا تھا آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگا۔

''اب حد ہو چکی ہے۔'' بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔ ''میں ضرور اب ڈیڈی سے بات کروں گی۔''

''کمال کرتی ہو۔'' فواد بول اٹھا۔ ''فیروز دین نے بنگلے کو چاروں طرف سے گھاس' پودوں اور

درختوں سے گھیر رکھا ہے۔ سانپ ایسی ہی جگہوں میں ملتے ہیں اور یہ کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں۔ احسن اگر اسے نہ مارتے تو وہ خاموشی سے جس طرف سے آیا تھا اسی طرف لوٹ جاتا۔''

''آپ کے اوپر سے سانپ گزرا ہوتا تو میں آپ سے پوچھتی۔'' زارا نے تیزی سے کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ آپ پے در پے حادثے ہوتے دیکھ رہے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو کوئی تجسس نہیں ہوتا کہ یہ سارے کے سارے واقعات احسن صاحب کے ساتھ ہی کیوں ہو رہے ہیں۔''

''میں تو اسے محض ایک اتفاق ہی کہہ سکتا ہوں۔''

''بس رہنے دیں۔ میں آپ سے کوئی رائے مشورہ طلب نہیں کر رہی ہوں۔''

''اچھا ابھی تو آپ تشریف رکھیں۔'' احسن نے نرمی سے کہا۔ ''وہ سب کچھ جو آپ کرنا چاہتی ہیں ناشتے کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔''

زارا اس وقت تو بیٹھ گئی ناشتا بھی کسی نہ کسی طرح کر لیا مگر وہ جو دل میں ٹھان چکی تھی اسے پورا کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اگرچہ اسے اس مسئلے پر حیدر علی صاحب سے بات کرنا خاصا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے کچھ واضح کچھ مبہم انداز میں وہ سب کچھ کہہ ہی دیا جو کہنا چاہتی تھی۔ نادیہ کے گھر کا واقعہ دہرایا اور بڑے یقین کے ساتھ شارق کے خلاف اپنا شبہ ظاہر کیا۔

حیدر علی صاحب اس کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ ایک طرف یہ شبہ کرنا خاصا مشکل معلوم ہو رہا تھا کہ ایک شریف خاندان کا لڑکا خواہ وہ کتنا ہی بدلگام کیوں نہ ہو' اس حد تک گر سکتا ہے۔ تو دوسری جانب متواتر تین چار حادثات کو محض اتفاق بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ انہوں نے زارا کو تو یہ اطمینان دلا کر واپس کر دیا کہ وہ ضرور اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے اور خود کافی غور و فکر کے بعد ذاتی طور پر ایس پی صاحب سے بات کرنے کے بعد وہ اسی شام ان کے گھر پہنچ گئے۔

سالار احمد صاحب نے پوری سنجیدگی سے حیدر علی صاحب کی باتیں سنیں تصدیق کے لیے نادیہ کو بھی بلا لیا گیا۔ اس نے اس واقعے کا اعتراف کیا اور سالار صاحب کی جرح سے مجبور ہو کر اسے دبی زبان میں یہ بھی کہنا پڑا کہ کچھ اور لڑکیوں کو بھی شارق سے اسی طرح کی شکایات ہیں لیکن اس نے پورے وثوق سے اس امر کی تردید کی کہ شارق ان پیش آمدہ واقعات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

''میں نے شارق کو سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''اور یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اس نے آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو آپ سے شکایت کر دوں گی۔ وہ آپ کے غصے سے بہت ڈرتا ہے۔ مجھے امید نہیں کہ اس نے اس کے بعد زارا کو پریشان کرنے کے بارے میں سوچا بھی ہوگا۔''

''مگر یقیناً کسی اور کا ہاتھ ان واقعات میں کیونکر ہوگا۔'' حیدر علی صاحب نے نرمی سے کہا۔ ''اور لگاتار تین حادثوں کے بعد انہیں محض اتفاق کہہ کر ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اس بارے میں۔'' نادیہ کی سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''آپ مطمئن رہیں حیدر علی صاحب۔'' سالار صاحب نے جواب دیا۔ ''میں اسے اپنے بیٹے کا معاملہ سمجھ کر یونہی چھوڑ نہیں دوں گا۔ میں نہ صرف اس سے بات کروں گا اور سختی سے ڈانٹوں گا بلکہ اس پر نگاہ بھی رکھوں گا کہ اس کا ان واقعات سے تعلق ہے یا نہیں۔''

حیدر علی صاحب بھلا اس سے زیادہ توقع بھی کیا کر سکتے تھے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ ایس پی صاحب ان سے اپنی رسمی دوستی کی وجہ سے بیٹے کو حوالات میں بھیج دیں یا اس کے ساتھ کوئی تھرڈ ڈگری والا برتاؤ کریں۔ سالار صاحب نے اپنی اصول پرستی اور سخت مزاجی کے باوجود اتنا کچھ کہہ سن لیا۔ یہی بہت تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایس پی صاحب کا شکریہ

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ادا کیا اور رخصت کی اجازت چاہی۔

فواد کی تمام تر کوششوں کے باوجود زارا شکار کے پروگرام میں حصہ لینے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ حیدر علی صاحب نے بھی کہا کہ بیٹی آج کل موسم اچھا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد گرمی میں شدت آجائے گی اور پھر دیہات کی گرمی تو تم لوگوں سے برداشت بھی نہیں ہوگی۔

مگر زارا نے جواب دیا کہ وہ فی الحال دو چار دن کہیں بھی نہیں جا سکتی۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ فواد نے اس نیم رضامندی کو بھی غنیمت سمجھا اور حیدر علی صاحب سے اجازت حاصل کرلی کہ وہ فیروز دین کو ذرا پہلے روانہ کردیں۔ تاکہ وہاں ان کے قیام اور شکار کا مناسب بندوبست ہوسکے۔

اور یہ فیروز دین کی روانگی سے ایک دن قبل صبح تقریباً گیارہ بجے کی بات تھی کہ رحیم اپنی گیند سے کھیلتا ہوا بنگلے سے باہر نکل گیا۔ اس وقت فواد اکیلا ہی کار لے کر باہر نکل گیا تھا۔ زارا اپنے کمرے میں تھی احسن کیلے کے پیڑوں کی چھاؤں میں کرسی ڈالے اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس نے رحیم کو گیٹ سے باہر جاتے دیکھ لیا تھا۔ کھیلتے کھیلتے رحیم نے گیند کو زور سے ٹھوکر ماری اور گیند لڑھک کر سڑک کے درمیان میں چلی گئی۔ رحیم اسے اٹھانے دوڑا۔ ٹھیک اسی وقت ایک کار اوسط رفتار سے بنگلے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ رحیم اچانک کار کے سامنے آ گیا۔ کار کے نوجوان ڈرائیور نے گھبرا کر کار کے بریک لگائے لیکن کار نے رکتے رکتے بھی رحیم کو ٹکر ماردی جو اس جیسی عمر کے بچے کے لیے بہرحال کافی شدید تھی۔ رحیم ٹکر کھا کر اچھلا اور پھر شانے کے بل سڑک پر گر کر بیہوش ہوگیا۔

کار کے پہیے بریک لگنے سے چیخے تو احسن چونک کر تیزی سے اٹھا اور اخبار پھینکتے ہوئے لپک کر تیزی سے گیٹ سے باہر نکلا۔ اس وقت تک نہ صرف کار کا ڈرائیور بلکہ دو تین راہ گیر بھی رحیم کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ احسن انہیں ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا اور جھک کر رحیم کی حالت دیکھی۔ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ کر باہر نکل آئی تھی اور خون بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ احسن نے جلدی سے جیب سے رومال نکالا اور رحیم کا کرتا سمیٹ کر کندھے کے اوپر رکھتے ہوئے بغل کے نیچے سے رومال ڈال کر گرہ لگادی جو نوجوان کار چلا رہا تھا۔ وہ بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا۔

"یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔" احسن نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری کار کہاں ہے۔"

"یہ سامنے کھڑی ہے۔" نوجوان نے جواب دیا۔ اس وقت تک چوکیدار اور فیروز دین بھی بنگلے سے باہر نکل آئے تھے۔ فیروز دین اپنے اکلوتے بیٹے کی حالت دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا۔

"گھبراؤ مت اپنے آپ کو سنبھالو۔" احسن نے سخت لہجے میں کہا۔ "رحیم کو بڑی احتیاط کے ساتھ گود میں اٹھا کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے نوجوان کی طرف دیکھا "میں اسے اسپتال لے کر جانا چاہتا ہوں تمہاری کار کی چابیاں کہاں ہیں۔"

"سوئچ ہی میں لگی ہوئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھو۔ کار میں ڈرائیو کروں گا۔ تم گھبرائے ہوئے ہو ڈر ہے کوئی اور حادثہ نہ کر بیٹھو۔"

احسن اس پرائیویٹ اسپتال سے واقف تھا جو حیدر علی صاحب کے فیملی ڈاکٹر کی نگرانی میں بڑی کامیابی سے چل رہا تھا اور کافی اچھا اسپتال سمجھا جاتا تھا۔ بنگلے سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ احسن تیزی سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے دس منٹ کے اندر وہاں پہنچ گیا۔

ڈاکٹر صاحب ڈیوٹی پر موجود تھے۔ رحیم کو فوراً ایمرجنسی وارڈ کے آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ احسن کی بروقت تدبیر نے خون بہنے کی رفتار کافی کم کردی تھی۔ پھر بھی ضرورت سے زیادہ خون ضائع ہوچکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر فوری طور پر خون نہ دیا گیا تو بچے کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

"میرے خون کا گروپ او پازیٹو ہے۔" احسن فوراً بولا۔ "آپ بلڈ ٹیسٹنگ میں وقت ضائع نہ کریں اور جتنی ضرورت ہو میرا خون لے لیں۔"

فوراً ضروری انتظامات کیے گئے احسن کو قریب ہی ایک دوسرے اسٹریچر پر لٹا دیا گیا اور پانچ منٹ کے اندر احسن کا خون رحیم کی رگوں میں پہنچ گیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر صاحب نے جو ایک اچھے سرجن بھی تھے۔ ہڈی کو اس جگہ بٹھایا زخم صاف کیا اور پھر ٹانکے لگا دیے۔ ہنسلی کی ہڈی کے لیے عارضی طور پر بینڈیج کردی گئی تھی کیونکہ اس صورت میں پلاسٹر نہیں چڑھایا جا سکتا تھا۔ یہ ساری کاروائی فیروز حسین کے سامنے ہورہی تھی جو ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ کھا کر بھی کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ بلکہ انتہائی کونے میں گھس کر کھڑا ہوگیا تھا۔

آپریشن مکمل کرکے ڈاکٹر صاحب مطمئن انداز میں باہر نکلے تو احسن بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ ایک صحت مند نوجوان تھا۔ تقریباً ڈیڑھ پوائنٹ خون دینے کے بعد کچھ ایسا زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب فیروز دین کو بھی یقیناً جانتے تھے اور رحیم کو بھی باہر آ کر انہوں نے مسکراتے ہوئے فیروز دین کی طرف دیکھا۔

"احسن صاحب کا شکریہ ادا کرو۔ فیروز دین۔" انہوں نے کہا۔ "اگر یہ فوری کاروائی نہ کرتے، زخم پر رومال باندھ کر رحیم کو جلد از جلد اسپتال نہ لاتے اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اپنا خون نہ دیتے تو تمہارے بیٹے کی زندگی بچنا مشکل تھی۔"

فیروز دین کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے احسن کے پیروں سے لپٹنا چاہا لیکن احسن جلدی سے پیچھے ہٹ کر اسے روک دیا۔

"کیا کرتے ہو فیروز دین۔" وہ بولا۔ "کرم کرنے والا اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ اسے رحیم کی زندگی بچانا تھی اور وہ میرے بجائے کسی اور کو بھی اس کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ شکر بھی اسی کا ادا کرو۔ اس کے علاوہ میں رحیم کا مقروض تھا وہ میری زندگی بچانے کا ذریعہ بنا تھا۔ خدا کا شکر ہے۔ میری کوشش کام آ گئی۔"

وہ نوجوان جس کی کار سے حادثہ ہوا تھا۔ وہ بھی موجود تھا۔ اس نے ایک بار بھی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن احسن نے اسے اطمینان دلایا کہ بظاہر اس کا قصور معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ صرف اتنا کردے کہ رحیم کے صحت یاب ہونے تک کے تمام میڈیکل اخراجات کی ذمے داری قبول کرے۔ نوجوان جو بہرحال کسی بڑے گھر کا فرد نظر آتا تھا۔ بڑی خوشی سے آمادہ ہوگیا۔

رحیم دو تین دن تک کافی سنبھل گیا۔ اس حادثے کی وجہ سے قدرتی طور پر فواد کا شکار والا پروگرام مزید تاخیر میں پڑ گیا تھا لیکن وہ مدت جس کے لیے فواد اور احسن کو مہمان بنایا گیا تھا۔ ختم ہونے کے قریب تھی۔ احسن کی چھٹی ختم ہونے میں بھی زیادہ دن نہ تھے اور فواد نے بھی اپنے کاروباری خسارے کا دکھڑا رونا شروع کردیا تھا۔ سوچا گیا کہ شکار کا پروگرام بنا ہی لیا جائے لیکن زارا نے اس شرط کے ساتھ آمادگی کا اظہار کیا کہ حیدر علی صاحب بھی ہمراہ چلیں۔ بیٹی کی ضد کے سامنے حیدر علی صاحب کو ہار ماننا پڑی۔ ویسے شاید وہ خود بھی چاہتے تھے کہ اس سفر میں وہ ان سب کے ساتھ رہیں۔ فیروز دین کو ایک روز قبل روانہ کردیا گیا۔

اس رات احسن سونے کے لیے اپنے بستر پر آیا تو اس نے حفظ ماتقدم کے خیال سے گردوپیش کا سرسری جائزہ لیا۔ یہ معمول اس نے سانپ کے حادثے والی رات کے بعد مستقل طور پر اختیار کرلیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے پلنگ کے نیچے نگاہ ڈالی تو ایک لفافہ نظر آیا۔ اس نے جھک کر وہ لفافہ اٹھالیا اوپر کوئی نام پتہ یا اسی نوعیت کی کوئی تحریر نہیں تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کسی نے غالباً کمرے کی کھڑکی سے پلنگ پر پھینکنے کی کوشش کی ہوگی لیکن لفافہ ہوا کے کسی جھونکے کی زد میں آ کر پلنگ

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے نیچے چلا گیا۔

لفافہ کھولا تو اندر سے لائنوں والا فل اسکیپ کاغذ تہ کیا ہوا نکلا کاغذ پر اس کے نام ایک خط تحریر تھا۔ خط کی تحریر سے معلوم ہوتا تھا کہ راقم خط یا تو کوئی معمولی پڑھا لکھا شخص ہے یا پھر کسی نے دانستہ طور پر حروف الفاظ بگاڑ کر اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ مضمون کچھ یوں تھا۔

"احسن صاحب

آپ کی زندگی بہت خطرے میں ہے۔ ایک آدمی ہر قیمت پر آپ کو مارنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ اب تک تین حملے کروا چکا ہے۔ جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں لیکن آپ کی قسمت اچھی ہے کہ آپ بچ گئے۔ اب اس شکار کے موقع پر وہ پھر آپ کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے اس کا بھید جاننے کی بہت کوشش کی مگر وہ جن لوگوں سے کام لیتا ہے۔ ان کو بھی پوری بات نہیں بتاتا بہتر تو یہ ہی ہے کہ آپ شکار پر نہ جائیں۔ کوئی بہانہ کر دیں لیکن اگر جانا ہی پڑے تو ہر طرح سے ہوشیار اور چوکنا رہیں۔ وہ کسی پیڑ کی آڑ سے آپ پر گولی چلا سکتا ہے۔ کسی خوفناک جانور کو آپ پر چھوڑ سکتا ہے۔ میں نے اسے شہر میں ایک ایسے آدمی کے گھر جاتے دیکھا ہے جو جانوروں کو سدھانے میں استاد ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ اس کے ساتھ مل کر کوئی گہری چال چل رہا ہے۔ میں آپ کو کوئی بھی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ شکار پر نہ جائیں۔ میں آپ کو اس آدمی کا نام نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ مجھے اور میرے خاندان کو تباہ کر دے گا۔

فقط آپ کا ایک بھلا چاہنے والا۔"

احسن نے پورا خط بڑی توجہ اور سنجیدگی سے ایک بار نہیں کئی بار پڑھا اور پھر اسے بڑی احتیاط سے لفافے میں رکھ کر اپنے سوٹ کیس میں منتقل کر دیا۔ اس رات وہ سونے کے لیے لیٹا تو بڑی دیر تک اس خط کی عبارت اور اس کے مضمون کی روشنی میں اس لکھنے والے کے علاوہ اپنے پوشیدہ گمنام دشمن اور ممکنہ چالوں کے بارے میں بھی سوچتا رہا اور پھر جب وہ آخرکار بہت مطمئن ہو کر سو چا ہے تو اس کا اندازہ تھا کہ اس نے صرف خط سے کاتب اور اپنے دشمن بلکہ اس کے منصوبے کا اندازہ بھی لگا لیا ہے اور یہ تو بہرحال کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ یہ اس کا نادیدہ دشمن جو کوئی بھی ہے۔ آخر کیوں اسے ختم کر دینے پر تل گیا ہے۔

وہ دوسرے دن صبح ہی روانگی کا پروگرام تھا لیکن احسن نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے تھوڑی دیر کی مہلت حاصل کی اور سیدھا نادیہ کے گھر پہنچا چند روز قبل ان حادثات میں شارق کا ہاتھ ہونے کا امکان زیر بحث آتا تھا۔ تب اس نے زارا سے نادیہ کے گھر کا پتہ بھی معلوم کیا تھا۔ محض دور اندیشی کے خیال سے کہ شاید کبھی ضرورت پڑ جائے۔ یہ دور اندیشی اب کام آ گئی۔ ورنہ وہ اس وقت زارا سے پتہ پوچھتا تو اسے بتانا پڑتا کہ اچانک نادیہ کے گھر جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے۔ بلکہ شاید زارا اس کے ساتھ جانے کے لیے بھی اصرار کرتی جبکہ ابھی احسن نہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ شارق سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ اور نہ شارق سے اپنی گفتگو کے موقع پر کسی کی موجودگی پسند کرتا۔

ایس پی صاحب کا بنگلہ کسی خاص دشواری کے بغیر مل گیا اور یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ اس وقت نادیہ بنگلے کے باہر گیٹ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اخبار والا بل لے کر آیا تھا اور وہ بل کی رقم ملازم کے ہاتھ بھجوانے کے بجائے خود ہی دینے آ گئی تھی۔ اس شکایت کے ساتھ کہ پچھلے ماہ سے اخبار زیادہ تر بڑی تاخیر سے ڈالا جا رہا ہے۔ جبکہ سالار صاحب ناشتے کے ساتھ اخبار دیکھنے کے عادی ہیں۔ احسن نے اسے دیکھا تو بغیر کسی تعارف کے پہچان گیا کہ نادیہ وہی ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف نادیہ بھی ایک جانی پہچانی کار سے ایک اجنبی نوجوان کو اترتے دیکھ کر رک گئی تھی۔

"معاف فرمائیے۔" احسن نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔ تو آپ نادیہ سالار ہیں۔"

"جی ہاں۔" نادیہ مسکرائی۔ "اور مجھے بھی کچھ اندازہ لگانے کی اجازت دیں تو میں کہہ سکتی ہوں کہ آپ احسن صاحب ہیں۔"

"ثابت ہو گیا کہ آپ واقعی ایس پی صاحب کی صاحبزادی ہیں۔" احسن بھی ہنسنے لگا۔

"کیونکہ میرا اندازہ بالکل کامن سنس پر مبنی تھا۔ ایس پی صاحب کے بنگلے کے سامنے روزمرہ کے گھریلو لباس میں ان کی بیٹی نادیہ ہی ہو سکتی تھی۔ خصوصاً اس لیے کہ ان کے بیٹے تو دو ہیں مگر بیٹی ایک ہی ہے۔"

"اور میں نے بھی غیر معمولی کمال کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔" نادیہ نے فوراً جواب دیا۔ "میں جانتی ہوں کہ حیدر علی صاحب کی ہے اور ان کی کار ان کے اور زارا کے علاوہ ڈرائیور ہی چلاتا ہے۔ ظاہر تھا کہ آپ ڈرائیور نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ میں اسے بھی جانتی ہوں۔ اب کسی اجنبی کے پاس اس کار کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ آپ ان دونوں مہمانوں میں سے ایک ہو سکتے ہیں جو آج کل حیدر علی کے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ زارا سے جو تعریف اور کسی حد تک حلیہ بھی سن چکی ہوں اس کی روشنی میں آپ کا فواد صاحب ہونا مجھے ذرا مشکل لگا۔ اس لیے یقینی بات تھی کہ آپ احسن صاحب ہی ہو سکتے ہیں۔"

"اور اسی لیے جادوگر صاحبان ہاتھ کی صفائی کے کرتب تو دکھاتے ہیں مگر ان کی ترکیب نہیں بتاتے۔ کیونکہ اگر ترکیب بتا دی جائے تو وہ بالکل آسان سی بات رہ جاتی ہے اور آدمی سوچتا ہے کہ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"بہرحال فرمائیے کیسے زحمت کی۔"

"میں شارق صاحب سے ملنے آیا تھا۔" احسن نے جواب دیا۔

نادیہ کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"لگتا ہے۔ ابھی تک آپ لوگ اپنے اسی خیال پر قائم ہیں۔" اس نے کہا۔

"جی نہیں میں اس سلسلے میں کسی خیال پر قائم نہیں ہوں۔" احسن نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "دو باتیں کرنے کو جی چاہا اور چلا آیا۔ خاص طور پر اس لیے کہ آج ہم لوگ نور پور جا رہے ہیں۔ میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں وہاں سے واپسی کے فوراً بعد ہی اپنے گھر چلا جاؤں گا تو پھر شاید ملاقات کا موقع نہ ملے۔"

"آپ لوگ نور پور جا رہے ہیں۔" نادیہ چونکی۔ "وہ کس لیے۔"

"وہاں سے قریب ہی کسی گاؤں میں حیدر علی صاحب کی زمینیں ہیں۔ سنا ہے آس پاس کے علاقوں میں کچھ شکار بھی مل جاتا ہے اور ہمارے فواد صاحب کو اپنے علاوہ شکاری ہونے کا بڑا دعویٰ ہے۔"

"یہ تو اچھا نہیں ہوا۔" نادیہ خفتا کسی سوچ میں ڈوبی نظر آنے لگی۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" احسن نے قدرے تعجب سے کہا۔ "کیا اچھا نہیں ہوا۔"

"شارق بھی دو دن قبل نور پور گیا ہے۔" نادیہ نے بتایا۔ "اس نے کہا تھا کہ وہاں اس کا کوئی دوست رہتا ہے۔ جس نے بڑے اصرار سے اپنی بہن کی شادی پر بلایا ہے۔ ابو نے اس کو اس خیال سے اجازت دے دی کہ موجودہ حالات میں وہ دور چلا جائے تو بہتر ہے لیکن اب ایسا لگتا ہے۔ جیسے یہ بھی کسی پریشانی کی وجہ بن سکتی ہے۔"

"آپ کا اندیشہ ایک حد تک درست معلوم ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا ہوگا نہیں۔" احسن نے قدرے مایوسی سے کہا۔ "اچھا اب اجازت دیں اور دعا کیجیے گا کہ سب خیریت سے رہے۔"

احسن واپس لوٹ گیا لیکن نادیہ کافی دیر تک وہیں گیٹ کے پاس جیسے کسی سوچ میں کھوئی رہی۔

روانگی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور احسن کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ حیدر علی صاحب شکار کے کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایسے زیادہ شوقین نہیں تھے۔ ان کے پاس جیسے کسی سوچ میں گم بیٹھی رہی۔

روانگی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور احسن کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ حیدر علی شکار کے کچھ ایسے زیادہ شوقین نہیں تھے۔ ان کے پاس ایک بندوق اور ایک رائفل تھی۔ ریوالور بھی تھا لیکن ظاہر ہے کہ وہ شکار کے مقصد کے لیے بیکار تھا۔ مگر ضرورت تھی کم سے کم تین بندوقوں کی۔ حیدر علی صاحب سوچ رہے تھے کہ نور پور پہنچ کر اپنے کسی دوست زمیندار سے عارضتاً مانگ لیں گے لیکن فواد نے ان کی پریشانی دور کر دی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے لیے ایک بندوق خرید چکا ہے اور زارا کے لیے اس کی خود ستائی کے پیش نظر یہ کوئی عجیب بات بھی نہ تھی۔

سفر کافی طویل تھا۔ اس لیے زارا نے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی رکھ لیا اگرچہ پروگرام یہ تھا کہ دوپہر تک نور پور پہنچنا مشکل نہ ہوگا اور وہاں حیدر علی صاحب کے ایک دوست کے گھر رک کر دوپہر کے کھانے کے بعد آگے چلا جائے گا۔

احسن نے زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ وہ اتنا پہلے پہنچ گیا کہ اپنی ضروری چیزیں...... جو اس نے پہلے سوٹ کیس میں پیک کر لی تھیں اطمینان سے دوسرے سامان میں شامل کر سکے۔ دونوں کاروں میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا فواد تو چاہتا تھا کہ وہ اور زارا ایک کار میں ہوں اور احسن حیدر علی صاحب کے ساتھ دوسری کار میں بیٹھے لیکن زارا جب حیدر علی صاحب کے ساتھ بیٹھ گئی تو فواد کو احسن کے ہمراہ ہی صبر کرنا پڑا۔

حیدر علی صاحب اپنی کار خود چلا رہے تھے اور دوسری کار دین محمد ڈرائیو کر رہا تھا کہ اسے راستوں سے آگاہی تھی۔ ٹھیک دس بجے یہ مختصر سا قافلہ روانہ ہو گیا اور ظاہر ہے کہ اس وقت کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ یہ سفر کس کس اعتبار سے یادگار ثابت ہونے والا تھا۔

سفر بغیر کسی پریشانی یا کسی غیر معمولی واقعے کے سکون و اطمینان سے جاری رہا۔ مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے اندازے سے کچھ پہلے ہی نور پور پہنچ گئے تھے۔ اس لیے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام بھی کر لیا گیا۔ پھر حیدر علی صاحب اپنی آبائی زمینوں کے لیے روانہ ہوئے اور یہ ہی آخری منزل بھی تھی۔ اس جگہ قیام کا فیصلہ اس لیے کیا گیا تھا کہ وہاں پر حیدر علی صاحب کی ایک حویلی تھی جہاں قیام کا خاطر خواہ انتظام تھا اس علاقے میں ایسے گھنے جنگل تو نہ تھے مگر پھر بھی شکار کا شوق پورا کیا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے کہ وہاں سے سندلی کا دلدلی علاقہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

مغرب سے کچھ پہلے یہ قافلہ جیانی پہنچ گیا جو حیدر علی صاحب کا آبائی علاقہ تھا جہاں حویلی کے دروازے پر فیروز دین ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ کاروں سے سامان اتارا گیا۔ سب کو ان کے کمرے دکھا دیے گئے۔ سب ہی پر تھوڑی بہت تھکن سوار تھی۔ اس لیے غسل کر کے لباس تبدیل کرنے کے بعد کی سرگرمیاں کھانے کی میز اور اس کے بعد پھر اگلے روز کے پروگرام کے بارے میں کچھ باتیں کرنے تک ہی محدود رہیں۔ صرف دو دن ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ اس لیے بغیر وقت ضائع کیے اگلی صبح ہی شکار کا پروگرام طے تھا۔

فواد نے ایک بار پھر زارا کو اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی مگر غالباً وہ اوپری دل سے کہہ رہا تھا کہ جب زارا نے انکار کر دیا تو اس نے ایک مرتبہ بھی اصرار نہیں کیا جو ایک طرح سے خلاف معمول تھا۔ طے یہ ہوا کہ اپنی مہارت ثابت کرنے کے لیے اور یہ تجویز فواد کی تھی۔ ہر شخص الگ الگ سمتوں میں شکار کرے اور سہ پہر کو جبکہ واپسی کا ارادہ تھا۔ مقابلہ کیا جائے کہ کسی نے کتنا شکار کیا۔ زارا نے حیدر علی صاحب کے ساتھ رہنے کا اعلان کیا۔ زیادہ تر اس لیے کہ اس کا ارادہ دوسرے دن یہ آوارہ گردی کرنے کا نہیں تھا اور حیدر علی صاحب پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ وہ ایک دن سے زیادہ اپنے شکاری مہمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ تقسیم کچھ اس طرح ہوئی کہ

upload by salimsalkhan

فواد کے ساتھ فیروز دین۔ احسن کے ساتھ دین محمد (تاکہ یہ اجنبی لوگ بھٹک نہ جائیں) اور حیدر علی صاحب کے ساتھ زارا۔

اس گفتگو کے بعد سب لوگ جلد ہی آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اگلے دن ناشتے کے بعد ہی شکاری پارٹیاں روانہ ہو گئیں۔ ایک قریبی گاؤں کو مرکزی مقام قرار دیا گیا تھا۔ حویلی میں حیدر علی صاحب کی ایک جیپ بھی کھڑی رہتی تھی۔ چنانچہ ہر پارٹی کو ایک ایک سواری بھی مل گئی تھی لیکن ظاہر تھا کہ یہ سواریاں صرف گاؤں تک پہنچنے کے لیے تھیں۔ اس کے بعد جتنا کچھ چلنا تھا۔ اپنے پیروں پر چلنا تھا۔ گاؤں والوں سے معلوم ہوا کہ ہر چند کہ اس علاقے میں جنگلی درندے عموماً نہیں پائے جاتے لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ گزشتہ دو تین راتوں سے کبھی کبھی جیسے کافی دور سے کسی شیر یا چیتے کی دھاڑنے کی آوازیں سننے میں آئی ہیں۔ مگر کسی نے کچھ دیکھا نہیں اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بہرحال شکار کا آغاز ہوا۔ احسن نے اپنے لیے جنوب کی سمت پسند کی تھی۔ حیدر علی صاحب اور زارا مشرق کی جانب نکل گئے تھے۔ فواد نے کوئی پابندی قبول نہیں کی۔ اس نے کہا کہ اسے شکار جہاں بھی نظر آیا گولی چلائے گا۔ البتہ اصولی طور پر وہ یہ کوشش کرے گا کہ عام طور پر مغرب کی جانب ہی رہے۔

دوپہر ایک بجے تک رفتہ رفتہ سب لوگ مرکزی مستقر پہنچے تو حیدر علی صاحب خالی ہاتھ تھے۔ احسن کو بھی کچھ نہیں ملا۔ مگر فواد مرغابیاں لایا تھا۔ جس کے لیے زارا دیر تک اس کا مذاق اڑاتی رہی کہ یہ شکار کی نہیں بلکہ خرید کر ذبح کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر کچھ بھی ہو۔ دوپہر کے کھانے میں لذیذ گوشت مل گیا تھا۔ تین بجے ایک بار پھر سب بندوقیں سنبھالے چل پڑے۔ حیدر علی صاحب نے تاکید کر دی تھی کہ سب لوگ ساڑھے پانچ بجے تک لازماً واپس آ جائیں۔ ان جنگلوں میں مچھروں کی بہتات تھی اور وہ نہیں چاہتے کہ وہ خود یا ان کے مہمان یہاں سے ملیریا میں مبتلا ہو کر واپس جائیں اور وہی بات نہ ہو جائے کہ شکار کرنے کو آئے شکار ہو کر چلے۔

احسن اور دین محمد آگے پیچھے چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک درخت کی شاخ کافی زور سے دین محمد کی پیٹھ پر لگی۔ یہاں جنگل کچھ گھنا تھا۔ درخت قریب قریب تھے۔ کبھی کبھی راستہ بنانے کے لیے انہیں شاخوں کو ہٹانا پڑتا تھا۔ غالباً ایسا ہی کچھ ہوا تھا کہ دین محمد نے ایک پیڑ کی شاخ سامنے سے ہٹانے کے لیے کسی دوسری شاخ میں الجھا دی اور آگے بڑھ گیا لیکن وہ شاخ اس پابندی سے آزاد ہو گئی اور ابھی دین محمد اس کی زد سے نکلا نہیں تھا کہ شاخ چھوٹ کر اس کی پشت سے ٹکرائی کم سے کم جب احسن نے پلٹ کر اسے کراہتے دیکھا اور وجہ پوچھی تو اس وقت اس کا اندازہ یہی تھا۔

دین محمد نے چوٹ کو نظر انداز کر کے دوبارہ اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کی مگر احسن نے بڑے اصرار سے اسے واپس کر دیا کہ اب اسے راستوں کا اندازہ ہو چکا ہے۔ وہ زیادہ آگے جانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا اس لیے دین محمد واپس لوٹ جائے۔ دین محمد کچھ زیادہ ہی تکلیف محسوس کر رہا تھا کہ اس نے ایک دو بار تکلفاً انکار کرنے کے بعد احسن کی بات مان لی اور واپس لوٹ گیا۔

احسن پھر آگے بڑھا لیکن ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اس نے اپنے بائیں جانب ایک دہاڑ سنی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو چند گز کے فاصلے پر ایک درخت کی قدرے نیچی اور موٹی شاخ پر ایک خوفناک چیتا نظر آیا۔ اس نے پھرتی سے بندوق سنبھالی ہر چند کہ وہ کسی درندے کے شکار کے لیے نہیں تھی۔ مگر اس میں دو کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کی آواز سے چیتے کو خوفزدہ تو کر ہی سکتا تھا۔ ابھی اس نے بندوق کندھے سے لگائی ہی تھی کہ کہیں قریب ہی پیچھے سے گولی چلنے کی آواز سنائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دی۔ احسن پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ گولی اسے نہیں لگی تھی لیکن وہ اس بات کو ابھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے گرتے ہی کچھ آگے ایک موٹے پیڑ کی آڑ سے کوئی ادھیڑ عمر آدمی نکلا جو احسن کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ وہ احسن کی طرف بڑھا۔ اب یہ قطعی ایک اتفاق تھا کہ ادھر وہ آدمی بڑھا اور ادھر اس چیتے نے شاخ سے جست لگائی۔ اس کا نشانہ خدا جانے احسن تھا یا نہیں لیکن ہوا یہ کہ وہ اس آدمی پر گرا اور بری طرح اسے جھنجھوڑنے لگا۔

وہ آدمی سخت آواز میں چیتے کو کسی نام سے پکارتے ہوئے روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو چیتے کی دھاڑ اور غراہٹ میں احسن کی سمجھ میں نہیں آسکا لیکن چیتا شاید کئی وقت بھوکا رکھا گیا تھا یا پھر کسی نا معلوم وجہ سے وہ اس قدر غصے میں تھا کہ اگر وہ آدمی اس کا ٹرینر تھا تب بھی وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا اور پھر احسن کے دیکھتے ہی دیکھتے چیتا اس آدمی کو جواب تک یا تو مر چکا تھا یا مرنے کے قریب تھا۔ گلے سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے جنگل میں غائب ہو گیا۔

فواد افتاں و خیزاں ہانپتا کانپتا گاؤں پہنچا تو زارا اور حیدر علی واپس آچکے تھے۔ دین محمد ان سے بھی پہلے پہنچ چکا تھا۔ فواد نے دور ہی سے حیدر علی صاحب کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ آوازیں سن کر حیدر علی صاحب اور زارا گھبرائے ہوئے باہر نکلے۔

”کیا بات ہے فواد۔“ حیدر علی نے اس کی حالت دیکھ کر پوچھا۔

”جلدی کیجیے انکل!“ فواد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ایک چیتا احسن کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ وہ میرے سامنے اس کا گلا چبا چکا تھا۔ مگر شاید ہم اس کی لاش ہی پانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ حیدر علی صاحب نے تیزی سے کہا۔ ”ان جنگلوں میں کوئی درندہ نہیں ہوتا۔“

”میں یہ نہیں جانتا لیکن میں شکار کی تلاش میں جنگل میں گھوم رہا تھا۔ تو میں نے چیتے کے دہاڑنے کی آواز سنی۔“ فواد نے جیسے پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بتایا۔ ”میں آواز کی سمت بڑھا ہی تھا کہ درختوں کے دوسری جانب میں نے ایک پیڑ کی نچلی شاخ پر ایک خوفناک چیتے کو دیکھا۔ احسن اس پیڑ سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ میں اس سے کافی دور تھا لیکن قدرے بلندی پر ہونے کی وجہ سے سب کچھ صاف صاف دیکھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ احسن کے ہاتھ میں صرف بندوق ہے۔ وہ اس سے چیتے کو زخمی کر سکتا ہے۔ مار نہیں سکتا۔ میرے پاس آپ کی رائفل تھی۔ میں نے فوراً چیتے پر گولی چلا دی۔ مجھے معلوم نہیں کہ گولی اس کے لگی یا نہیں لگی لیکن اس نے احسن پر جست لگائی اور اسے دونوں پنجوں سے دبوچ کر بھنبھوڑنے لگا' میرے دیکھتے ہی دیکھتے چیتے نے اس کا گلہ اور چہرہ چبا ڈالا۔ میں بہت گھبرا گیا تھا۔ پھر بھی میں نے دوسری گولی چلانا چاہی لیکن چیتا احسن کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے جنگل میں غائب ہو گیا۔“

زارا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی مگر حیدر نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا۔

”مگر فیروز وہ کہاں ہے۔“ انہوں نے تیزی سے پوچھا۔ ”وہ تو تمہارے ساتھ تھا۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ فواد نے جواب دیا۔ ”میں اسے چھوڑ کر دوسری طرف گھوم گیا تھا اور اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ کوئی مرغابی وغیرہ دیکھے تو مجھے آواز دے دے۔ میرا خیال ہے کہ شاید میں انجانے میں اس سے کافی دور نکل گیا تھا۔“

حیدر علی صاحب نے فوراً ہی دس پندرہ گاؤں والوں کی دو پارٹیاں ترتیب دیں' اندھیرا ہونے لگا تھا۔ اس لیے مشعلوں کا انتظام کر لیا گیا اور وہ سب فواد کی راہنمائی میں اس مقام کی طرف چلے جہاں فواد کے بقول چیتے نے احسن پر حملہ کیا تھا راستے میں فیروز دین بھی مل گیا۔ اس نے بتا کہ وہ فواد کی تلاش سے مایوس ہو کر واپس آ رہا تھا۔ اس نے گولیاں چلنے

کی آواز ضرور سنی تھی۔ مگر کچھ دیکھا نہیں تھا۔ اسے بھی ساتھ لے لیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جائے واردات پر پہنچ گئے۔ یہاں دور تک خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف احسن کی بندوق بھی پڑی ہوئی مل گئی۔ زمین پر لاش کو گھسیٹتے جانے کے نشانات بھی کچھ دور تک کافی واضح تھے اور خون میں چیتے کے پنجوں کے نشانات فواد کی بیان کردہ داستان کی پوری طرح تصدیق کر رہے تھے۔ مشعلیں جلالی گئیں۔ وہ سب نشانات کے سہارے آگے بڑھنے لگے۔ مگر کچھ دور تک نمایاں رہنے کے بعد نشانات کم اور ہلکے ہو گئے۔ یہاں تک کہ مزید آگے جا کر جنگلی گھاس میں بالکل ہی غائب ہو گئے۔

فواد کے بیان کی روشنی میں اور مقام واردات کی حالت دیکھنے کے بعد احسن کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن پھر بھی حیدر علی صاحب نے دونوں پارٹیوں کو جنگل میں دور دور تک چیتے کی تلاش کی تاکید کر دی۔ یہ بھی امید تھی کہ لاش خواہ کسی بھی حالت میں ہو مل تو جائے گی۔ پھر اب اس خونخوار چیتے کا مارنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

اس کے منہ کو خون لگ گیا تھا اور وہ آس پاس کے تمام دیہات کے لیے مستقل خطرہ بن سکتا تھا۔ مگر رات کے گیارہ بارہ بجے تک دونوں پارٹیاں جنگل میں بھٹکنے کے بعد واپس آ گئیں۔ انہیں نہ چیتا نظر آیا اور نہ ہی لاش ملی تھی۔

وہ رات سب نے اور خصوصاً زارا نے کس طرح گزاری یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی حیدر علی صاحب نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں محکمہ پولیس میں ان کی اچھی واقفیت تھی۔ حسن اتفاق یہ ہوا کہ ایک ڈی ایس پی دورے پر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو یہ حالات سنے تو اسی وقت پولیس کی نفری لے کر حیدر علی صاحب کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔

دوسری طرف ایک اور عجیب بات ہوئی۔ صبح دس گیارہ بجے کے قریب کسی گاؤں والے نے زارا کو ایک لفافہ لا کر دیا کہ کوئی آدمی جسے وہ بالکل نہیں پہچانتا دے گیا ہے کہ حیدر علی صاحب کی بچی کو پہنچا دیا جائے اور خدا جانے اس لفافے میں کیا لکھا تھا کہ زارا نے اسی وقت فیروز دین کو ساتھ لیا۔ جنگل میں مقام واردات پر جا کر ایک چھوٹے سے بکس کی شیشی میں کچھ لکھ کر ڈالے اور فیروز دین کے ساتھ شہر روانہ ہو گئی۔

حیدر علی صاحب' ڈی ایس پی صاحب کو لے کر واپس آئے تو انہیں یہ اطلاع ملی۔ وہ پریشان ہو گئے تھے۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ فیروز دین بھی زارا کے ساتھ گیا ہے۔ وہ کچھ مطمئن ہو گئے۔ بلکہ بہتر یہ ہی سمجھا کہ زارا اس ماحول سے نکل کر چلی گئی۔

ڈی ایس پی صاحب نے فواد کا بیان لیا اور اس نے ایک مرتبہ پھر پورے وثوق سے چیتے کے احسن پر حملہ کرتے' اس کے زمین پر گرنے اور پھر بعد میں بے رحمانہ انداز میں چیتے کے اسے بھنبھوڑنے اور لاش لے کر غائب ہو جانے کی وہی داستان سنائی جو وہ پہلے بیان کر چکا تھا۔ ڈی ایس پی صاحب نے پولیس کے تمام جوانوں کو جنگل میں پھیلا دیا اور حکم دے دیا کہ چیتے کو دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔ جو اسے شکار کرے گا اسے انعام دیا جائے گا لیکن پورے دن کی تلاش کے باوجود نہ چیتے کا کوئی پتہ چلا نہ لاش یا اس کے باقی حصے ہاتھ آئے۔ ڈی ایس پی صاحب نے رات کو اسی جگہ قیام کا فیصلہ کیا کہ اگلے دن ــــ جہاں تک دیکھا جا چکا ہے۔ اس سے آگے تلاش جاری رکھی جائے۔

اگلی صبح پولیس پارٹی کے ساتھ ڈی ایس پی صاحب خود بھی گئے مقام واردات کا جائزہ وہ پہلے ہی لے چکے تھے۔ کافی دور تک تلاش کی نگرانی کرنے اور ہدایت دینے کے بعد وہ دوپہر کو گاؤں واپس آ گئے۔

ڈی ایس پی صاحب' حیدر علی صاحب اور فواد

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھانے سے فارغ ہو کر موجودہ حالات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ زارا اور فیروز دین شہر سے واپس آ گئے۔ حیدر علی صاحب اسے دیکھ کر واقعی حیران ہوئے تھے۔

''یہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو بیٹی۔'' انہوں نے پوچھا۔ ''میں تو مطمئن تھا کہ چلو اچھا ہوا تم واپس چلی گئیں لیکن اب تم پھر لوٹ آئی ہو۔ کیا بات ہے۔''

''ابھی بتاتی ہوں ڈیڈی۔'' زارا نے جواب دیا اور ڈی ایس پی صاحب سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''شہر میں کچھ دن پہلے ہمارے مالی فیروز دین کے سات سالہ بیٹے کا خطرناک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اسے فوری خون کی ضرورت تھی۔ احسن کا خون فوراً ہی اس لیے لے لیا گیا کہ ان کا گروپ او پازیٹو تھا جو کسی بھی گروپ والے کو دیا جا سکتا ہے۔''

''یہ سب میں جانتا ہوں بیٹی! مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔'' ڈی ایس پی صاحب نے نرمی سے پوچھا۔

''میں مقام واردات سے خون کا نمونہ لے گئی تھی۔'' زارا نے بتایا۔ ''اور وہاں کی ایک اچھی لیبارٹری میں اسے ٹیسٹ کرایا۔ وہ خون ہرگز او پازیٹو نہیں ہے بلکہ اے بی پازیٹو گروپ کا ہے۔ تصدیق کے لیے آپ یہ رپورٹ خود دیکھ سکتے ہیں۔''

اب ڈی ایس پی صاحب ہی نہیں۔ حیدر علی صاحب کی کیفیت بھی دیکھنے کے قابل تھی۔

''دوسرے الفاظ میں میں یہ کہنا چاہتی ہوں۔'' زارا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ خون خواہ کسی کا بھی ہو۔ احسن صاحب کا ہرگز نہیں ہے اور وہ مجھے پوری امید ہے کہ بفضل خدا زندہ ہوں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' بے اختیار حیدر علی صاحب کے منہ سے نکلا۔

''مگر یہ کیسے ممکن ہے۔'' فواد بول اٹھا۔ ''میں نے خود چیتے کو احسن پر حملہ کرتے اور اسے مارتے دیکھا ہے۔ اگر وہ خون جس کا نمونہ تم لے گئی تھیں۔ احسن کا نہیں تو ضرور چیتے کا ہوگا۔ میں نے اسے گولی ماری تھی۔ وہ بھی یقیناً زخمی ہوگا۔''

''فواد صاحب! کسی چیتے کا خون پازیٹو اے بی نہیں ہو سکتا۔'' زارا کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ ڈی ایس پی صاحب بھی قدر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اچانک چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ ''تم آپ نے اپنی مطلب براری کے لیے بہت پاپڑ بیلے لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو بیٹی۔'' ڈی ایس پی صاحب نے پوچھا۔

''انکل اس شخص نے۔'' اور اب زارا کا لہجہ بڑا تلخ اور طنزیہ تھا۔ ''حرص و ہوس میں اندھا ہو کر متعدد بار احسن صاحب کی جان لینے کی کوشش کی انہیں کار سے کچلنا چاہا سر پر بھاری گملا گرا کہ مارنا چاہا۔ سانپ سے ڈسوانے کی کوشش کی اور پھر بھی ناکام رہا تو اپنے ایک دوست کے ذریعے سرکس کے ایک ٹرینر کو خرید کر اس جنگل میں ایک چیتا منگوایا اسے بھوکا رکھا گیا اور پھر شکار کی آڑ میں احسن کو اس چیتے سے مروانے کی کوشش کی۔''

''انکل۔'' خود ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ حیدر علی کی طرف تھا۔ ''میں اس الزام تراشی کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہوں۔ ان میں سے کوئی بات بھی ثابت نہیں کی جا سکتی زارا کچھ بھی کہے میں نے چیتے کو احسن......''

''آدمی کی جب شامت آتی ہے تو اس کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔'' زارا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بے شک اس ٹرینر کو تاکید کر دی تھی کہ کام ہوتے ہی وہ ایک لحہ نہ ٹھہرے اور چیتے کو ساتھ لے کر فوراً شہر چلا جائے۔ اسی لیے تم مطمئن ہو کہ تمہارے بقول چیتے کے احسن پر حملہ کرنے کی داستان کو جھوٹا قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن تم نے اتنی سی بات نہیں سوچی کہ وہ خون احسن کا نہیں تو پھر کس کا ہے۔ درندہ بھی غصے اور بھوک میں اپنے ٹرینر کا بھی شکار کر سکتا ہے۔''

''کیا۔'' فواد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''جی ہاں بات صرف ایک لیبارٹری رپورٹ کی نہیں احسن زندہ ہے اور فیروز دین جو انہیں مردہ سمجھ کر خاموش تھا۔ اب تمہارے تمام جرائم کا کچا چٹھا بیان کرنے پر آمادہ ہے بے شک تم نے گاؤں میں اس کی کھیتی اور اس کے خاندان کو تباہ برباد کرنے کی دھمکی دے کر اسے اپنا آلہ کار بنایا تھا۔ مگر احسن نے اس کے بیٹے کی زندگی بچا کر اسے اپنا گرویدہ کر لیا اور وہ انہیں ہوشیار رہنے کا اشارہ کر چکا تھا۔''

''اگر احسن زندہ ہے تو کہاں ہے۔'' حیدر علی صاحب نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ زارا اس سوال کا کوئی جواب دیتی اچانک ایک پولیس جیپ سامنے آ کر رکی' اس میں سے ایک سب انسپکٹر کود کر نیچے اترا۔ جیپ میں سفید چادر میں لپٹی ہوئی کوئی چیز بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ڈی ایس پی کے قریب آ کر سیلوٹ کیا۔

''سر۔'' اس نے کہا۔ ''ہم نے اس چیتے اور لاش کا پتا چلا لیا ہے۔ جنگل کے بالکل آخری حصے میں ایک ویگن اور ٹرالر جس پر درندوں کو بند رکھنے کا پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ ملا ہے۔ چیتا اسی پنجرے میں تھا اور لاش ویگن کے پاس پڑی تھی۔ پنجرے کا منہ کھلا تھا۔ مگر اب ہم نے اسے بند کر دیا ہے اور وہ لاش کسی نوجوان کی معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے جسم پر اس قسم کا لباس ہے۔ جیسا لباس مسٹر احسن کے جسم......''

ایس آئی کا بیان یہیں تک پہنچا تھا کہ فواد ایک جست مار کر اچھلا اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکنے کی کوشش کرتا۔ وہ حیدر علی کی جیپ میں بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ ڈی ایس پی صاحب نے ایس آئی اور ان کانسٹیبلوں کو جو جیپ میں آئے تھے اسے پکڑنے کا حکم دیا اور خود بھی اپنی جیپ میں اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔

دوسری طرف حیدر علی صاحب بڑی بے تابی سے زارا کی طرف بڑھے۔ ''بیٹی' احسن کہاں ہے۔'' انہوں نے پوچھا۔

''کار میں۔'' زارا نے ہلکی ہنسی سے اشارہ کیا۔ ''میں شہر سے واپس آ رہی تھی تو یہ مجھے جنانی کے مقام پر ملے۔ گزشتہ رات انہوں نے وہیں حویلی میں گزاری تھی۔''

حیدر علی صاحب کار کی طرف لپکے ادھر احسن کار سے اترا اور انہوں نے اسے بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ ''تم زندہ تھے بیٹے تو پھر یہاں کیوں نہیں آئے۔'' وہ بولے۔ ''تم نے یہ نہیں سوچا کہ ہم لوگوں کے دلوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔''

''کچھ مجبوری تھی ماموں جان۔'' احسن نے جواب دیا۔ ''میں چاہتا تھا کہ فواد کو اپنی سازش کی کامیابی کا یقین ہو جائے۔ صرف اسی طرح اسے پکڑا جا سکتا تھا۔''

ادھر یہ خوشگوار ملاپ ہو رہا تھا اور دوسری جانب فواد اندھا دھند جیپ چلاتے ہوئے فرار ہونے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ پولیس کی دونوں جیپیں اس کے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ ڈی ایس پی صاحب نے اس کی جیپ بے کار کرنے کے لیے ریوالور نکال کر ٹائروں کو نشانہ بنانا چاہا۔ فواد اس فائرنگ سے اور بھی بدحواس ہو گیا۔ راستے میں نہر کے ایک تنگ پل سے گزرنا لازمی تھا۔ اس پل سے گزرتے ہوئے فواد جیپ پر کنٹرول نہیں رکھ سکا اور جیپ پل کے جنگلے کے اوپر سے اڑتی ہوئی نہر میں جا گری۔ نیچے گرتے ہوئے فواد کا سر جیپ سے ٹکرایا' وہ بے ہوش ہو کر پانی میں گرا اور ڈوب گیا۔ شام تک نہر سے اس کی لاش برآمد کر لی گئی۔

فیروز دین کے اور احسن کے بیانات پھر پولیس کی مکمل تحقیقات سے تمام واقعات عیاں ہو کر سامنے آ گئے تھے۔ ان تمام معاملات سے شارق کا سرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بیچارہ واقعی اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ نادیہ کی دھمکی نے اس کے تمام جذبات ٹھنڈے کر دیے تھے۔ زارا کو اس کا شبہ صرف دو وجوہات سے ہوا تھا۔ اور تو اس کے ذہن

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں شارق کے خلاف شبہ بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے فیروز دین کے خدوخال میں قدرے شارق کی صورت کی جھلک تھی۔ اس کا قد و قامت بھی کسی حد تک شارق سے ملتا تھا۔ ورنہ کار سے کچلنے کی کوشش بھی اسی نے کی تھی اور گملا بھی اسی نے پھینکا تھا۔ فواد نے اس مقصد کے لیے کرائے کی ایک کار استعمال کی تھی۔ سانپ ایک پیشہ ور سپیرے سے حاصل کیا گیا تھا اور اسے خود فواد نے احسن کے کمرے میں چھوڑا تھا۔ مگر رحیم کے حادثے نے فیروز دین کے دل پر گہرا اثر کیا۔ اب وہ اس شخص کے قتل کا آلہ کار نہیں بن سکتا تھا۔ جس نے اپنا خون دے کر اس کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ اس نے فواد کو انکار بھی کیا لیکن فواد کی دھمکیوں نے اسے مجبور کر دیا پھر بھی اس نے وہ خط لکھ کر احسن کو خبردار کرنے کی کوشش کی وہ جانتا تھا کہ فواد اپنے کسی دوست کے ذریعے سرکس کے ٹریز کو خرید چکا ہے اور اسے چیتے کے ساتھ کئی دن پہلے ہی ان جنگلوں میں روانہ کر چکا ہے۔ جہاں شکار کھیلنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔

مقصد قتل کا معاملہ کچھ پیچیدہ تھا۔ یہ بات قدرے کھٹک رہی تھی کہ محض زارا سے شادی کرنے کے لیے فواد اپنے واحد رقیب کو جان سے مارنے پر تل جائے اول تو اسے یقین تھا کہ زارا احسن کو اس پر ترجیح نہیں دے سکتی لیکن اس نے اپنی حماقت سے اپنے کردار اور مزاج کے وہ رخ زارا کو دکھا دیے جو شاید کبھی آگے جا کر شادی ہو جانے کی صورت میں سامنے آتے۔ اس نے زارا کا واضح رجحان احسن کی طرف دیکھ کر اسے ہر قیمت پر اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کا بنیادی مقصد مزید تفتیش و تحقیق سے سامنے آ گیا۔ پتا چلا کہ فواد کی تمام امارت اور دولت مندی ایک دکھاوے کی صورت میں باقی رہ گئی تھی' کاروبار وہ اپنی حماقتوں اور عیاشیوں میں تباہ کر چکا تھا۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے بے دریغ اپنی تمام زرعی زمینیں اور شہری جائداد رہن رکھتا چلا گیا۔ قرض خواہوں کے تقاضے شروع ہو چکے تھے اور اسے مکمل تباہی سے بچانے کی تنہا صورت یہ تھی کہ اس کی شادی زارا سے ہو جائے جو ایک کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یہ شادی ہی کافی مدت کے لیے اس کے قرض خواہوں کو مطمئن کر سکتی تھی۔ اس کے بعد یقیناً وہ زارا سے اس کی دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور اگر حیدر علی صاحب بقید حیات رہتے تو خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ اس کے اگلے منصوبے کیا ہوتے۔

فواد اور ٹریز کی موت سے قانونی صورت حال بہت بدل گئی تھی۔ فیروز دین کا اپنا طرز عمل بھی اس کی پشیمانی کا شاہد تھا۔ پھر اس کے بیان کے بغیر کیس کی کڑیاں سلجھ بھی نہیں سکتی تھیں اس لیے اسے سلطانی گواہ بنا لیا گیا۔ پولیس فواد کے اس دوست کو بہت تلاش کرتی رہی۔ جس کی مدد سے اس نے کار حاصل کی۔ سانپ خریدا' ٹریز تک پہنچا لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا' ٹریز بڑی حد تک اپنی موت کا خود ذمے دار تھا اور ویسے بھی اس کی موت ایک حادثہ ہی کہی جا سکتی تھی۔ سرکس کے مالک کو ان تمام باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ سرکس ان دنوں بند تھا اور کسی دوسرے شہر جا کر وہاں پروگرام پیش کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اس لیے پولیس نے بھی یہ ہی بہتر سمجھا کہ فیروز دین کو سلطانی گواہ بنا کر چھوڑ دیا جائے۔ فواد کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ گولی چلانے کے بعد رکا نہیں بلکہ احسن کو گرتے دیکھ کر واپس چلا گیا وہ مطمئن تھا کہ باقی کام ٹریز مکمل کر لے گا۔ دوسروں کو اس نے وہی داستان سنائی جو اس کے خیال میں پیش کرنا چاہیے تھی لیکن اس نے جو گڑھا احسن کے لیے کھودا تھا۔ وہ خود اس میں گر گیا اور اس کی موت دوسروں کے لیے داستان عبرت بن کر رہ گئی۔

اس کے بعد احسن ہی تھا جو زارا کا انتخاب اور حیدر علی کی پسند ہو سکتا تھا۔

upload by salimsalkhan
www.paksociety.com